Urdu Studies
An international, peer-reviewed, bi-lingual research journal
ISSN: 2583-8784 (Online)
Vol. 5 | Issue 1 | Year 2025
Pages: 1-14

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے[1]

(اداریہ)

ارشد مسعود ہاشمی

۲۰۱۴ کی بات ہے۔ ''اینوئل اوف اردو اسٹڈیز'' کے آخری شمارے (زیر ادارت پروفیسر محمد عمر میمن) میں شمس الرحمن فاروقی کے تعاون سے فرانسس پریچٹ کے ذریعہ کیے گئے ''آب حیات'' کے انگریزی ترجمے پر تحسین فراقی کا تبصراتی مضمون (جو پہلے اردو میں منظر عام پر آچکا تھا) شائع ہوا تھا۔[2] فراقی نے اس میں مقامی اور غیر مقامی کی بحث چھیڑتے ہوئے پریچٹ کے سلسلے میں جو فقرے استعمال کیے وہ غیر ادبی اور نازیبا تھے۔ ''داستان امیر حمزہ'' کے پریچٹ کے ترجمے کی روشنی میں دس بارہ برسوں قبل تک خاکسار بھی اسی خیال کا پابند تھا۔[3] فراقی کے رویے میں شدت پسندی تھی۔ چودھری محمد نعیم نے اس رویے کی گرفت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر مقامی غیر مقامی کے قضیے میں ہی الجھے رہے تو پھر who might dare to intrude upon the study of Urdu? انھوں نے اس احساس

[1] ۔ مرزا غالب کا مصرع۔

[2] Firaqi, Tahsin. “The English Translation of Ab-e Hayat: A Review Article.” https://minds.wisconsin.edu/bitstream/ handle /1793/68890/09Firaqi.pdf?sequence=1&isAllowed=y

[3] Hashmi, Arshad Masood. “An Oral Narrative in Urdu: Occidental vs Oriental Approach of Translation.” *Khuda Bakhsh Library Journal*, No. 179, 2012. Pp. 15-33.

Vol. 5 | Issue 1 | Year 2025

کا اظہار بھی کیا کہ فراقی کے شدید جارحانہ لہجے سے وہ ششدر رتھے کیونکہ ان سے دوبار ملاقات اور ان کی کچھ تحریریں پڑھنے کے بعد وہ انھیں ہمیشہ ایک ”معقول شخص“ سمجھتے تھے۔ اینوئل کی اشاعت کے تیرھویں برس اس عزیز جریدے کے آخری شمارے میں اس کی اشاعت بھی اتنی ہی حیران کن تھی۔ مضمون میں ترجمے کی آڑ میں خاص طور پہ پروفیسر فرانسس کو ہدف بنایا گیا تھا۔

سیدھی سی بات تھی یہ، لیکن اس میں کئی اندیشے بھی پوشیدہ تھے۔ فراقی کی نگاہوں میں اگر یہ ترجمہ اتنا ہی ناپسندیدہ تھا تو اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر انھیں خود ترجمہ کر دینا چاہیے تھا۔ انھوں نے پریچیٹ سے قبل اس کے ترجمے کی فکر کیوں نہ کی؟ انھیں یہ احساس کیوں نہ ہوا کہ ”آب حیات“ یا اس جیسے بے شمار کلاسیکی سرمایے کو اردو کے پیرہن سے باہر نکالا جائے تاکہ دنیا اس کے محاسن کا اعتراف کر سکے، اور مقامیت کو آفاقیت کے تناظر میں رکھا اور پرکھا جا سکے۔ لیکن فراقی کا مضمون جس مقامیت پر اصرار کرتا ہے وہ کئی معنوں میں لاحاصل ہے۔ اس کے منفی پہلوؤں میں سب سے اہم یہ ہے کہ وہ متون کو صرف مقامیت کے حوالے سے سمجھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اس کے سبب ان کی تفہیم محدودیت کی پابند ہو جاتی ہے۔ پریچیٹ کے ”داستان امیر حمزہ“ کے ترجمے کے ساتھ صورت حال قدرے مختلف تھی۔ ہر دانشور کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ متن کا اپنے طور پہ مطالعہ اور تجزیہ پیش کرے۔ جب مقامی رنگ و آہنگ سے مزین ایک متن کسی بھی غیر مقامی کے لیے دلچسپی کا باعث بنتا ہے تو اس کی دلچسپی کے اپنے جواز ہوتے ہیں۔ مشرف علی فاروقی نے جب ”داستان امیر حمزہ“ کا ترجمہ کیا تو پریچیٹ پر ان کا اعتراض یہ تھا کہ انھوں نے داستان کے معتبر نسخے کا انتخاب نہیں کیا۔[4] پریچیٹ نے مولانا عبدالباری آسی والے نسخے کا استعمال کیا تھا، فاروقی نے مولوی حافظ عبداللہ بلگرامی کے نسخے سے اس کے چنندہ حصوں کا ترجمہ کیا۔ یہ لائق تحسین عمل تھا۔ مشرف فاروقی کے ترجمے کا جواز یہ تھا کہ غیر مقامیوں کے لیے ترجمہ ایسا ہونا چاہیے جس میں مقامی رنگ و بو موجود رہے۔ اس خیال کے مد نظر یہ

[4] Farooqi, Musharraf. “Dastan-e Amir Hamza Sahibqiran: Preface to the Translation.” https://minds.wisconsin.edu/bitstream/ handle/1793/18153/12farooqim.pdf?sequence=2&isAllowed=y

واضح ہوتا ہے کہ اردو متون کے انگریزی ترجموں کی دو صورتیں ہیں: ایک صورت ایسی ہے جس میں کوئی غیر مقامی اس تہذیب کو سمجھنے کی مخلصانہ کوشش کر رہا ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ ایک مقامی اپنی تہذیب سے اغیار میں آشنائی پیدا کر رہا ہے۔ دونوں اپنی جگہ اہم ہیں، اور دونوں صورتوں میں ہدف تک رسائی ہی اہم ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں مقامیت کو ایک عالمی پس منظر مہیا کیا جا رہا ہے۔ ان میں نو آبادیات کے ردعمل میں ایک مثبت رجحان موجود ہے۔ لہذا، مقامی غیر مقامی کی اصطلاحیں ہی محل نظر بن جاتی ہیں۔ ناصر عباس نیر لکھتے ہیں کہ:

> نیٹو ایک شناختی زمرہ تھا جو سفید فام یورپیوں کے شناختی زمرے سے یکسر الگ تھا۔ نیٹو کا لفظ التباس سے بھرپور تھا۔ اپنے لغوی معانی میں، نیٹو مقامیت، زمین، اصل سے وابستہ شخص ہے مگر استعماریت کی پیدا کردہ تاریخی صورتِ حال میں یہی نیٹو اپنی ہی زمین پر اجنبی، اپنی دیسی شناخت سے کٹا ہوا اور اپنی اصل سے برگشتہ ہے۔ سفید فام یورپی، اپنی اصل کو، بیرونی جگہوں پر بھی جس شدت سے برقرار رکھتا ہے، اسی شدت سے نیٹو کو اپنی اصل سے برگشتہ رکھتا ہے۔[۵]

نیٹِو کے اسی تصور نے نو آبادیاتی عہد میں محکوموں کی مکمل ثقافت کو قابل اصلاح ٹھیرایا تھا۔ لیکن مابعد نو آبادیاتی مباحث نے تصویروں کا رخ ہی پلٹ دیا، اور محکوم ثقافتوں کی بوقلمونی کو سمجھنے سمجھانے کی دیانتدارانہ کوششیں کی جانے لگیں۔ اس لحاظ سے پریچٹ کے تراجم میں نو آبادیاتی مکالموں جیسی نوعیتیں نہیں ملتیں۔ تاہم، مجموعی اعتبار سے بہتر یہ ہے کہ اس بحث سے دامن محفوظ رہے کیونکہ متن کو جیسا ہم چاہتے ہیں ویسے ہی دوسرے بھی سمجھیں، کا اصرار بین ثقافتی مکالموں کے دروازے بند کر دیتا ہے۔

[۵] ۔نیر، ناصر عباس۔ ”نیٹِو کی کیا سند ہے، صاحب کہیں تو مانوں: سفید فام جمالیات“۔ https://urdu studies.in/urdu-studies-vol-3-issue-1-october-2023-10

فراقی کے تبصرے کے پس پردہ "ہم اور وہ" والی ذہنیت تو تھی ہی، تفاخر اور خود پسندی کے جذبات بھی تھے جس سے ادب کو بجائے فائدہ، خسارہ زیادہ ہوا ہے۔ انھوں نے شمل کے ساتھ بھی یہی رویہ اپنایا ہے۔ اس ضمن میں یہ کہنا کافی ہے کہ مقامی اور غیر مقامی کی بحثوں سے ادب کی تفہیم و ترسیل کے دائرے محدود ہو جاتے ہیں۔ پروفیسر نعیم نے اسے مابعد نو آبادیاتی کلامیوں کا ایسا رویہ تصور کیا ہے جس کی مخالفت ضروری ہے۔

For all I know, that could be a new post-colonial theory and I should receive it with silent reverence, but demur I must. [6]

مغربی خاتون دانشوروں نے جنوبی ایشیائی مطالعات میں اسلامی تہذیب، اسلامی ادب اور برصغیر میں اردو زبان و ادب کی روایتوں پر بطور خاص توجہ مرکوز کی ہے۔ ان کے دانشورانہ کارنامے ایک مستقل علمی روایت کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ ان میں سے بعض نے عربی، فارسی اور اردو زبان میں براہِ راست مہارتیں حاصل کیں اور متون کا مطالعہ اصل زبان میں کیا، بعض نے مغربی دانشورانہ کلامیوں کی روشنی میں تراجم اور تجزیے کے ذریعے نئے فکری دروازے وا کیے۔ ان کے تحقیقی طریقۂ کار، علمی دیانت اور کثیر لسانی مہارت نے جو نتائج اخذ کیے ان سے نہ صرف مغربی دنیا میں بلکہ خود برصغیر میں بھی فکری و ادبی مباحث کو تقویت ملی۔ مزید برآں، ان کے مباحث نے اردو زبان و ادب، نیز اردو تہذیب کو بیسویں صدی کے اواخر سے مغرب کی دانشورانہ دلچسپی کا محور بھی بنایا ہے۔

ہمارے لیے یہ پہلو اہم ہے کہ جب ہم فروعی معاملات اور لاحاصل ادبی مباحث میں الجھ کر اپنی پشت تھپتھپانے میں مصروف تھے تب برطانوی اور امریکی محقق خواتین اسلامی فکر و فلسفہ، صوفیانہ روایات، جنوب ایشیائی مسلم معاشرت اور اردو شعر و ادب سے اپنی دلچسپیوں کا اظہار کرتے ہوئے گرانمایہ تحقیقی کام سرانجام دے رہی تھیں۔ شاہ ولی اللہ سے سر سید احمد خان تک، شرعی معاملات، تاریخ اسلام اور فقہ و فتاویٰ سے تصوف تک، داستان سے میر و غالب، اقبال و فیض، دکنی شعر و ادب،

[6] Naim. C. M. "Our Ungenerous Little World of Urdu Studies." https://cmnaim.com/2014/06/02/our-ungenerous-little-world-of-urdu-studies/

ڈراما، نوٹنکی، پارسی تھیٹر، ناول یہاں تک کہ ابن صفی کو این میری شمل، فرانسس پریچٹ، کارلا پیٹو یچ، مرسیا ہر مینسن، باربرا مٹکاف، کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ، کیتھرین ہینسن، اگنیئشکا کچیوچ فراش، عائشہ ہدایت اللہ، اور سعدیہ شیخ جیسی دانشوروں نے اپنے مطالعات کا مرکز بنایا ہے۔ ان کے یہاں تحقیقی موضوعات کا ایک تنوع ملتا ہے جس میں بین المتونیت، ادبی و تہذیبی تناظر اور تاریخی پس منظر کا امتزاج موجود ہے۔ ان علمی خدمات کا اہم ترین فائدہ یہ ہوا کہ مغرب اور برصغیر کے درمیان فکری مکالمہ یوں مضبوط ہوا کہ مغرب سے ہی مغربی نو آبادیاتی بیانیوں کا مدلل استرداد کیا جانے لگا۔ ماوا و مسکن میں مسلسل حاشیے پر رکھے جانے کے باوجود اردو تہذیب و ادب کے سلسلے میں مغربی قارئین کو معیاری اور غیر متعصبانہ معلومات دستیاب ہونے لگیں۔ اس کا دوسرا نمایاں اثر یہ ہوا کہ ہماری مکمل ثقافت کنویں سے باہر نکلنے لگی، ہماری رسائی دور تک ہونے لگی، اور برصغیر کے محققین کو اپنی روایت کا ایک بیرونی، غیر جانبدار لیکن سنجیدہ مطالعہ و محاسبہ میسر آنے لگا۔ پروفیسر شمیم حنفی کا یہ بیان اہم ہے کہ شکاگو میں نعیم صاحب نے، وسکانسن میں محمد عمر میمن نے اور انگلستان میں اگر رالف رسل اور ڈیوڈ میتھیوز نے اردو زبان اور ادبیات کی تعمیر اور ترقی کا بیڑا نہ اٹھایا ہوتا تو مغربی دنیا میں اُردو زبان و ادب کی تدریس اور قبولیت کا قصہ یقیناً مختلف ہوتا۔[7] یہ وہی نقشہ ہے جس میں کسی قسم کی عصبیت نہیں ملتی ہے۔ اس تمام دانشورانہ لین دین میں گرچہ دونوں ہی صنفوں کے دانشوروں کی عملداری رہی ہے، اور اب بھی ہے، خواتین تعصبات کا شکار ہو جاتی ہیں۔

اس حقیقت سے فرار ممکن نہیں کہ جنوبی ایشیائی مطالعات کے مختلف ابعاد میں بیسویں صدی کے اواخر سے مغربی دانشوروں، نیز مغرب میں موجود مشرقی دانشوروں نے اس علمی منظرنامے کو وسیع، متنوع اور زیادہ بامعنی بنایا ہے۔ ''اردو اسٹڈیز'' کے خاص شمارے کا اعلان اسی فکری پس منظر میں کیا گیا تھا۔ ہمیں اس اعتراف میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی کہ سال بھر کے انتظار کے بعد بھی

[7] شمیم حنفی، شمیم۔ ''چودھری محمد نعیم۔'' ہم نفسوں کی بزم میں۔ نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ۲۰۰۶۔ ص ۲۵۰۔

Vol. 5 | Issue 1 | Year 2025

خاص شمارے کے تعلق سے اردو میں ہمیں تحقیقی مضامین نہیں مل سکے۔ کئی ایسے اصحاب ہیں جو متعلقہ موضوعات کے ساتھ انصاف کر سکتے ہیں۔ ان حضرات و خواتین سے رابطہ کیا گیا لیکن ان کی تدریسی اور انتظامی مصروفیتیں مانع رہیں۔ کم و بیش یہی صورت حال انگریزی میں لکھنے والوں کے ساتھ بھی تھی۔

ادارہ پروفیسر سرورالہدیٰ کا شکر گزار ہے کہ بہت ہی کم وقفے میں انھوں نے دو قیمتی تحریریں فراہم کر دیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق چودھری محمد نعیم سے ہے جبکہ دوسری تحریر تنقید و تحقیق کی ہماری موجودہ روش، ادب پاروں ہی نہیں، ادیب و شاعر کے ساتھ ہمارے عمومی رویے کے سلسلے میں چند سوالات قائم کرتی ہے۔ سطور بالا میں جن نکات کی نشاندہی کی گئی ہے، ان کے تناظر میں سرورالہدیٰ کا یہ بیان توجہ طلب ہے کہ نقاد کا غصہ جب مطلق العنان ہو جاتا ہے تو پھر تنقید کو اس سے نقصان ہی پہنچتا ہے۔ نقاد کا خود سر اور بے لگام ہو جانا کسی ادبی معاشرے کے لیے کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔

علاوہ ازیں اردو کے حصے میں سات ایسی تحریریں بھی شامل اشاعت ہیں جو مغربی خواتین دانشوروں میں سے ایک معروف شخصیت این میری شمل سے تعلق رکھتی ہیں۔ پروفیسر سید سراج الدین اور پروفیسر ضیاء الدین شکیب سے شمل کے ذاتی تعلقات رہے ہیں، اس لیے ان کی تحریریں ہمیشہ اہم رہیں گی۔ گرچہ پروفیسر تحسین فراقی تنقید و تحقیق کے معاملے میں سخت گیر واقع ہوئے ہیں، شمل پر لکھا گیا ان کا مضمون ان مباحث کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا جن میں مقامی (نیٹو)، غیر مقامی کے منفی پہلو ملتے ہیں۔ پروفیسر ناصر عباس نیر، پروفیسر مہر افشاں فاروقی، پروفیسر اخلاق احمد آہن اور نعیم اللہ ملک نے شمل کی بعض تحریروں کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ترجمے کے لیے ان اصحاب علم کے ذریعہ شمل کے مصادر کا انتخاب تو اہمیت رکھتا ہی ہے، ان کے رواں دواں ترجموں نے شمل کو سمجھنے میں آسانیاں بھی فراہم کی ہیں۔

انگریزی حصے کے مقالوں میں مختلف موضوعات کی تحریریں شامل ہیں۔ لیکن خاص نمبر کے حوالے سے ایک مقالہ کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ بیسویں صدی سے اردو علوم میں مغربی خواتین اسکالرز کی تبدیلی پر مبنی لیکن متنازعہ شراکت ایک اہم دانشورانہ موضوع ہے۔ اس کا تعلق بیک وقت اردو

Urdu Studies
Vol. 5 | Issue 1 | Year 2025

ادب، اسلامیات، تصوف اور ثقافتی تاریخ نگاری کی از سر نو تعریف اور تعین اقدار سے ہے۔ ڈاکٹر محمد سمیع العظیم اور عقید الحق کے مقالے میں این میری شمل، فرانسس پریچیٹ، اور کارلا پیٹیویچ جیسی شخصیات پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے متن کے تجزیے، آرکائیول ریسرچ، اور تقابلی فریم ورک کو اس دلیل کے لیے استعمال کیا گیا ہے کہ ان اسکالرز نے یورو امریکن اور جنوب ایشیائی دانشورانہ روایات کو فروغ دینے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

عارف الرحمن ملا نے اپنے مقالے میں دلائل پیش کیے ہیں کہ انا سورووا نے ادبی تنقید، ثقافتی تاریخ، اسلامی مطالعات، اور فنون لطیفہ کی تاریخ کے مطالعوں کے ذریعہ اردو ادب کو ایک عالمی شناخت فراہم کی ہے۔ انھوں نے اردو کی ثقافتی اہمیت سے بھی دنیا کو متعارف کرایا ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک ثقافتی سفیر کی حیثیت رکھتی تھیں جنھوں نے اردو کی ثقافتی تکثیریت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے مشرق و مغرب کے دانشورانہ مکالموں میں روح عصر سے مستعار نئی جان ڈال دی ہے۔ مثنوی، غزل، داستان وغیرہ کے باریک بیں مطالعات و مشاہدات پر مبنی ان کے نتائج مختلف اصناف میں اسلامی ثقافتی سیاق و سباق کو مزید روشن کرتے ہیں۔ ان کے زیادہ تر کارنامے ایسے ہیں جو مستقبل کی تحقیق کے لیے رہنمائیاں بھی کرتے ہیں۔

ممتاز امریکی مورخ باربرا ڈیلی میٹکاف نے بیسویں صدی کے اواخر سے جنوبی ایشیائی مسلمانوں سے متعلق اپنے اہم کاموں کے ذریعے اردو مطالعات اور اسلامی دانشوری کو نئے موضوعات فراہم کیے ہیں۔ ڈاکٹر امداد حسین کا مقالہ اسلامی اصلاحی تحریکوں اور مولانا اشرف علی تھانوی کی تالیف ''بہشتی زیور'' کے سلسلے میں میٹکاف کے بین علومی مطالعات پر مبنی ہے۔ مقالے میں اردو مصادر کے ساتھ ان کی وابستگی اور ان مطالعات کی ثقافتی اہمیت کی تفہیم کو واضح کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے سماجی تاریخ، صنفی مطالعات، اور مابعد نوآبادیاتی نظریات کی روشنی میں پر ان کی علمی میراث کا جائزہ قلمبند کیا ہے۔

پروفیسر مرسیا ہرمینسن نے اپنی تحقیقوں میں اسلامی مطالعات کے متنوع پہلوؤں کو جس جذب دروں اور ذوق و شوق کے ساتھ اختیار کیا ہے اس کی مثالیں اب خود ہمارے یہاں بہت کم ملتی

ہیں۔ اردو اور فارسی مصادر کی جستجو اور بہت ہی وسیع تناظر میں ان کے استعمال کی وجہ سے زیادہ تر مقالے علم و بصیرت کی نئی دنیائیں آباد کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ سے مولانا اشرف علی تھانوی اور خواجہ حسن نظامی تک تصوف کی سبھی روایتیں اور تذکرے ان کے مطالعوں کا محور ہیں۔ اس شمارے میں انھوں نے اسلامی روایات کی تشکیل و تعمیر اور توسیع میں جنوب ایشیائی تذکروں اور سوانح عمریوں کے کردار کا جائزہ لیتے ہوئے اسلامی تشخص کے ساتھ شہر کاری کے ان مراحل کی تفہیم کی کوشش کی ہے جن میں تکیوں، خانقاہوں، مقبروں کی تعمیر نیز اردو اور فارسی رسائل و ملفوظات کو کلیدی اہمیت حاصل تھی۔

گذشتہ کچھ برسوں میں اسلامی حقوق نسواں کی آوازیں مسلم معاشرے کی پدرانہ نوعیت کے خلاف ایک طاقتور آواز کے طور پر ابھری ہیں ۔ اسلام اور حقوق نسواں ، یہ دو الفاظ اور ان کے تصورات ایک دوسرے سے متصادم ہیں ، اس لیے ان کا امتزاج ہی بہت سے دانشوروں کے لیے حیران کن ہے ۔ مسلم معاشرے میں پدرانہ نظام کی مخالفت اور مذہبی معاملات کی روشنی میں ادب تخلیق کرنے کی روایات ہر زبان میں موجود ہیں۔ اسلامی حقوق نسواں بڑی حد تک دانشورانہ گفتگو تک محدود ہے جو دو دہائیوں سے جاری ہے۔ اس لحاظ سے یہ تازہ ہوا کا جھونکا ہے جس کے اثرات ابھی تک مکمل طور پر ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔ پروفیسر ارشد مسعود ہاشمی اور ڈاکٹر نور فاطمہ کا مقالہ ان عوامل کی وجوہ اور اثرات کے پہلو بہ پہلو ان عوامل کے مطالعہ کا احاطہ کرتا ہے جن کے سبب اسلامی تانیثیت ایک موثر آواز بننے لگی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے سلسلے میں دو مقالے پیش کیے جا رہے ہیں۔ آزادی کے بعد کے برسوں میں فلمیں حقیقت پسندی اور ترقی پسندی کے نظریات کو عوام تک پہنچانے کا اہم ذریعہ بن گئیں۔ راجندر سنگھ بیدی ترقی پسند ادیبوں کی تحریک سے وابستہ تھے۔ وہ ہندوستانی فلم انڈسٹری میں بطور ہدایت کار، اسکرین رائٹر اور مکالمہ نگار بھی کام کرتے تھے۔ ان کی کہانیاں انسانی شخصیت اور نفسیات کی حقیقی صورت پر مبنی ہیں، فرد اور معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں پیچیدہ تعلقات معنی خیز اور

بلیغ انداز میں بیان کیے گئے ہیں، جنھیں اردو افسانے کے شہکاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فاطمہ صدیقی کے مقالے میں راجندر سنگھ بیدی کی فلموں میں زندگی اور انسان کے تعلقات کو سمجھنے اور اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بیدی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ کسی خاص نظریے کے سخت پابند نہیں ہیں۔ عام انسانوں کے دکھ سکھ کو موضوع بناتے ہیں۔ ان کی سماجی حقیقت پسندی اور فکشن نگاری کا دیانت دارانہ انداز ہی لوگوں کو انھیں ترقی پسند کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ ڈاکٹر عائشہ عرفان نے یہ واضح کیا ہے کہ بیدی اس وابستگی سے نالاں نہیں تھے۔ اپنے ہم عصر ادیبوں کی طرح وہ بھی ہندوستان کی تقسیم سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ مقالے میں بیدی کی افسانوی تکنیک سے متعلق یہ پہلو نمایاں کیا گیا ہے کہ اس میں انسانی جذبات کو بے باکی سے ظاہر کرنے کا ہنر موجود ہے۔ مزید یہ کہ ان کے موضوعات درمیانے اور نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جن کو درپیش سماجی ناانصافیاں اور اقتصادی مسائل بیدی کے لیے اہم ہیں۔

سعادت حسن منٹو کے تعلق سے نئے موضوعات پر دو مقالے اور منٹو کے ایک افسانے کا ترجمہ تنقیدی مطالعے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ مشرف عالم ذوقی کے افسانے میں بھی منٹو کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

نو آبادیاتی دور میں نافذ قوانین میں سے بیشتر کی نوعیت استحصالی تھی۔ احمد عقیل سرور کا استدلال ہے کہ سعادت حسن منٹو نے "نیا قانون" کے ذریعہ حکومت کے اس حربے کو زد میں لینے کی کوشش کی ہے۔ نو تاریخیت کے نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے اس مقالے میں منٹو کے افسانے کا تجزیہ ۱۹۳۵ کے ایکٹ اور متعلقہ تاریخی دستاویزات کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ یہ تحقیق نو آبادیاتی نظام کی غیر آئینی نوعیت کو اجاگر کرنے کے ساتھ ہی سامراجی استحصال کے طریقۂ کار اور شہری حقوق پر ان کے اثرات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے راہیں ہموار کرتی ہے۔ ڈاکٹر گرجا سوری کے مقالے میں منٹو کی مختلف تحریروں اور معاشرے میں فن کے کردار اور نوعیت کے سلسلے میں ان کے تبصروں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ یہ سمجھا جاسکے کہ ایک واضح نظریاتی اور سماجی طور پر پرعزم ادبی تحریک میں

”ترقی پسند“ مصنف ہونے کا کیا مطلب ہے۔ مقالہ نگار نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ”ترقی پسند“ مصنف کے طور پر منٹو کی حیثیت کا از سر نو جائزہ لیا جانا چاہیے تاکہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے اندر موجود دراڑوں، اس بنیاد پرست تحریک کے نقصانات جو خواندگی کے معیار کا تعین کرنے کے حق پر فخر کرتی ہے، اور ان بھرے ہوئے رشتوں کے اندر ایک ایسے مصنف کے تعلقات دریافت کیے جا سکیں جو اپنے پڑھے جانے کا جواز بھی رکھتا ہے۔

”انگارے“ کے تعلق سے چار اہم تحقیقی مضامین شائع کیے جا رہے ہیں۔ ”انگارے“ کی دو اہم اشاعتیں (۱۹۳۲ اور ۱۹۹۵) منظر عام پر آئی تھیں۔ ”انگارے“ کی دوسری اشاعت خالد علوی نے لندن کے برٹش میوزیم میں محفوظ مائیکرو فلم کی مدد سے کی تھی۔ پروفیسر خالد علوی اور تاریکا پربھاکر کے مقالے میں پئیغ بودیو (Pierre Bourdieu) کے نظریات کی روشنی میں یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ طاقت کے شعبے اور سنسر شپ کے تعلقات ادب کی تخلیق و تشہیر پر کس طرح اثر انداز ہوئے ہیں۔ مقالہ نگاروں کی دلیل ہے کہ علوی کے ذریعہ متعارف کی گئیں ترمیمات بیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان کے مطبوعاتی نظام اور اس کے سرمایہ دارانہ سیاق و سباق کی علامت ہیں، جو تب سلمان رشدی کی ”دی سیٹینک ورسز“ جیسے ناولوں کے احتساب شدہ مباحثوں میں محصور تھا۔ مقالے میں دونوں اشاعتوں کے دوران میں سماجی حالات کا تاریخی تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

”انگارے“ کی اشاعت کے پس منظر میں یہ نکتہ اہم ہے کہ اس نے نہ صرف ترقی پسند تحریک کی بنیادوں کی استواری میں کلیدی کردار ادا کیا، یہ مثالیں بھی قائم کیں کہ ترقی پسند ادب کیسا ہونا چاہیے۔ تابندہ صادق کا مقالہ اسی روشنی میں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس میں پریم چند کے خطاب اور اس منشور کے تجزیے پر مبنی ہے جسے سجاد ظہیر نے لندن میں تیار کیا تھا۔

ڈاکٹر علمی رضا نے ”انگارے“ میں شامل سجاد ظہیر کی دو کہانیوں ”دلاری“ اور ”جنت کی بشارت“ کو موضوع بنایا ہے۔ ان کہانیوں نے مجموعے کی دیگر کہانیوں کی طرح شدید ہنگامہ اور تنازعہ پیدا کیا تھا۔ یہ مقالہ ان کی روشنی میں خواتین کی کمزوری، گھریلو غلامی اور مردانہ اور جاگیردارانہ

معاشرے میں ان کے استحصال، نیز معاشرت میں مذہبی منافقت اور دوغلے پن کے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔

جنوبی ایشیائی شناخت کے نو آبادیاتی دقیانوسی تصورات، تقسیم کے آس پاس کے برسوں میں ابھرنے والی فرقہ وارانہ کشمکش، اور ہندوستان میں پسماندوں کے حالات کو موضوع بناتے ہوئے رحمہ علی نے "انگارے والی" رشید جہاں کی کہانی "میرا ایک سفر" کو نئے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ انھوں نے عورت، ذات اور مذہبی شناخت کی نمائندگی کے بارے میں رشید جہاں کے زاویۂ نظر کا گایتری چکرورتی اسپیواک کے مستضعفین کے تصور کی روشنی میں تجزیہ کیا ہے۔

معروف نقادوں نے قرۃ العین حیدر کا موازنہ گیبریل گارسیا مارکیز سے کیا ہے لیکن ترجمے کی محدودیت کے سبب عالمی طور پر انھیں وہ پذیرائی نہیں ملی جس کی وہ مستحق ہیں۔ ڈاکٹر نائلہ انجم کا استدلال ہے کہ سوانحی ناول "کارِ جہاں دراز ہے" فکر و فن کے لحاظ سے اتنا کامیاب ناول ہے کہ اس کے انگریزی ترجمے سے حیدر کو عالمی فکشن میں ایک قابلِ قدر مقام حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ اسے کئی معاملوں میں "آگ کا دریا" سے زیادہ اہم تصور کرتی ہیں۔ انھوں نے اس ناول کے کچھ حصوں کے ترجموں کے ساتھ مصنفہ کی موضوعاتی وابستگیوں کو از سرِ نو تلاشنے کی کوشش کی ہے تاکہ انگریزی دانوں کو قرۃ العین حیدر کی فنکاری کے ساتھ ہی علمی وسعت اور تاریخی بیانیوں پر ان کی گہری نظر سے متعارف کیا جا سکے۔

انم صدیقی نے امروہہ کے مشاعروں میں خواتین شعرا کی نمائندگی کو موضوع بنایا ہے۔ مقالے میں روایتی طور پر مرد حضرات کی اجارہ داری والے اردو کے مشاعروں میں صنفی تقسیم کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ امروہہ کے ادبی حلقوں میں خواتین کی فعالیت کو بطورِ خاص محدود رکھنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں اور اس شہر کی ثقافت میں پدرسری صنفی سیاست خواتین کی خودمختاری پر پابندیاں لگاتی رہی ہے۔

ہندوستان میں اردو صحافت کے تاریخی ارتقا، عصری حیثیت اور سماجی و سیاسی اثرات کے مطالعوں پر مبنی ڈاکٹر شاہ عالم اور ڈاکٹر صائبہ خاتون کے مقالے کا بنیادی موضوع برطانوی نو آبادیاتی دور میں "جام جہاں نما" سے شروع ہونے والی اپنی شناخت قائم کرنے کی جد وجہد ہے۔ مقالہ نگاروں کا خیال ہے کہ اردو صحافت نے تبھی سے تاریخی طور پر سیاسی گفتگو، ثقافتی تحفظ اور معاشرتی مشغولیت کے لیے ایک اہم پلیٹ فارم مہیا کیا ہے۔ تحریک آزادی ہند کے دوران میں اس نے رائے عامہ کو متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کیا، تو آزادی کے بعد اردو ذرائع ابلاغ نے رائے عامہ کو تشکیل دینے، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے اور سماجی انصاف کے مسائل کو حل کرنے کی ہمہ جہت کوششیں کی ہیں۔

انگریزی تراجم کی اشاعت ہماری ترجیحات میں شامل ہے۔ اس شمارے میں ہم نے تین افسانوں کے ترجمے شائع کیے ہیں۔ منٹو کے اشتعال انگیز افسانہ "اصلی جن" کے ترجمہ سے قبل اس کے تنقیدی مطالعے میں ڈاکٹر حارث قدیر نے یہ سوالات قائم کیے ہیں کہ منٹو نے فحاشی کے الزامات بھگتنے اور اس سلسلے میں قانونی بندشوں کے بعد بھی اس موضوع سے کنارہ کشی اختیار کیوں نہیں کی۔ مترجم کا خیال ہے کہ عمر کے آخری مرحلوں میں لکھی ہم شہوتی جذبات والی اس کہانی پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ یہ مطالعہ ان سوالوں کے جواب دینے کی کوشش بھی کرتا ہے کہ آیا منٹو نے معاشرتی دباؤ کا شکار ہو کر اپنی آخری آزمائش کے بعد لکھنا بند کر دیا؟ اگر ایسا نہیں کیا تو، اس نے اپنے افسانوں میں جنس اور جنسی قربت کے موضوعات کو کس طرح سمونے کی کوشش کی؟ مزید یہ کہ اگر وہ اشتعال انگیز کہانیاں لکھتا رہا تو اسے مزید قانونی آزمائشوں کا نشانہ کیوں نہ بنایا گیا؟ منٹو کا افسانہ "اصلی جن" قائم شدہ اخلاقی معیاروں کو چیلنج کرنے اور قابل قبول گفتگو کی حدود کو آگے بڑھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر قدیر کا استدلال ہے کہ عوام، ناقدین اور عدلیہ کی جانب سے ایسی تحریروں کا رد عمل وقت کے ساتھ بدل سکتا ہے، خاص طور پر آزادی اظہار اور فنکارانہ آزادیوں کے گرد بڑھتے ہوئے مباحث کے پیش نظر بھی۔

مشرف عالم ذوقی کا افسانہ "فیصلہ" مرکزی کردار کو ثریٰ کے خواب کی کہانی ہے جس میں اس کی ملاقات سعادت حسن منٹو سے ہوتی ہے۔ یہ کہانی ملک میں سرگرم طاقتور سماجی اور سیاسی قوتوں کی اس

بے پناہی کا مظاہرہ کرتی ہے جس نے منٹو جیسے فرد کو بھی اخلاقی مفاہمت کے لیے مجبور کر دیا۔ پروفیسر بانی برت مہنتا اور واتسل روہیلا نے اس کہانی کے ترجمے سے قبل ذوقی کی افسانہ نگاری پر تبصرے کے دوران میں لکھا ہے کہ اس میں منٹو کا کردار بار بار ان قوتوں اور لوگوں پر ان کے اثرات کے متعلق لکھنے کے لیے الفاظ تلاش کرنے میں اپنی نااہلی پر اصرار کرتا ہے۔ کہانی میں فسادات اور انکاؤنٹر میں ہونے والی ہلاکتوں، کچھ نہ لکھنے کی منٹو کی مجبوری، اور آخر میں اس کا سمجھوتہ کرلینا دراصل اس اجتماعی انجانے خوف کی نشاندہی کرتا ہے جسے کوثر بی کے خواب کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔

خالد جاوید کے افسانے اور ناول موضوعات اور بیانیوں کے سبب دانشورانہ حلقوں میں ہمیشہ زیر بحث رہے ہیں۔ "نعمت خانہ" کے انگریزی ترجمے پر دیے گئے انعام نے ان کے فکشن کو انگریزی دانوں کے درمیان بھی مقبول بنایا ہے۔ خالد کے زبان و بیان کی وجہ سے ان کے فکشن کا ترجمہ ایک پیچیدہ عمل ہے۔ ڈاکٹر فاطمہ ایم نے خالد جاوید کا تعارف اور ان کے افسانے "سائے" کا انگریزی ترجمہ قلمبند کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کہانی کی پیچیدگی اور وسعت تصورات کے پیش نظر اس کا ترجمہ کرنا آزمائشی تھا۔ چونکہ ترجمہ محض ماخذ اور ہدف کی زبان کے درمیان ایک لسانی یا معنیاتی تبادلہ نہیں ہے، اس لیے چند الفاظ کو اردو میں اصل حالت میں برقرار رکھا گیا ہے تا کہ ان سے وابستہ ثقافتی اور علاقائی جوہر کو محفوظ رکھا جا سکے۔

"اردو اسٹڈیز" کی مجلس مشاورت کی معزز رکن پروفیسر مرسیا ہرمینسن دو ماہ قبل حبیب یونیورسٹی، کراچی میں Lady Fatima Chair in Women and Divinity پر سرفراز ہوئی ہیں۔ پروفیسر انیس الرحمن بھی اس مجلس کے محترم رکن ہیں۔ انھوں نے اردو کی منتخب شاعری کا انگریزی ترجمہ "ہزاروں خواہشیں ایسی" کے عنوان سے شائع کیا تھا جسے سال ۲۰۲۴ کے ساہتیہ اکادمی ترجمہ انعام سے نوازا گیا ہے۔ ادارہ دونوں دانشوروں کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

پروفیسر چودھری محمد نعیم (۳/ جون ۱۹۳۶ء–۹/ جولائی ۲۰۲۵ء) مغرب میں اردو زبان و ادب کی تدریس اور تحقیق و تنقید کے نئے زاویے وضع کرنے والے، نیز جنوب ایشیائی تناظر میں اردو سے

وابستہ ان ثقافتی مطالعات کو ہمہ گیر شناخت عطا کرنے والے اساتذہ کرام اور محققین کی پہلی صف میں شامل ہیں جن میں متعصبانہ رویوں کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔ان کے رفقا اور شاگردوں کی وسیع تعداد مغربی جامعات ہی نہیں، بر صغیر میں بھی فروغ علم میں مصروف ہے۔پروفیسر سی ایم نعیم کی بیش بہا خدمات کے اعتراف میں ہم اس شمارے کو ان کی یادوں کی نذر کرتے ہیں۔"محفل" سے "سالنامہ دراسات اردو"(اینوئل اوف اردو اسٹڈیز)تک کا سفر ہمارے لیے ہمیشہ نشان راہ رہے گا۔اس شمارے کے لیے پروفیسر فاطمہ رضوی کی نگہداشت میں لکھے جامع مضمون میں محمد صدیق خان نے چودھری صاحب کی شخصیت اور گوناگوں علمی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ وہ اس تصور کے خلاف تھے کہ غیر مقامی دانشوروں کو اردو ادب کے مطالعوں اور ترجموں کو اہمیت نہ دی جائے ۔اردو کے حصے میں پروفیسر سرورالہدی کے تاثرات شامل کیے گئے ہیں۔ انھوں نے جا بجا پروفیسر شمیم حنفی کی ایک تحریر کا ذکر کیا ہے۔ اردو میں پروفیسر شمیم حنفی مرحوم کا وہ مضمون کسی بھی اردو والے کی جانب سے لکھی گئی پہلی ایسی تحریر ہے جس میں چودھری صاحب کی شخصیت اور دانشورانہ پہلوؤں کا مفصل احاطہ کیا گیا ہے۔اس کی اہمیت کے پیش نظر حسب ضرورت حواشی کے ساتھ مکرر اشاعت کی جارہی ہے۔

ہمارے پاس اس جریدے کو جاری رکھنے کے لیے نہ تو مالی وسائل ہیں، نہ ہی انسانی وسائل۔ ادارت سے اشاعت تک کے تمام امور صرف پروفیسر فاطمہ رضوی کے تعاون سے پورے ہوتے ہیں۔ ہمیں خوشی بھی ہے اور اطمینان بھی کہ "اردو اسٹڈیز" کی ادارت کی ذمہ داری لکھنؤ یونیورسٹی میں انگریزی اور جدید یورپی زبان کے شعبے سے وابستہ پروفیسر فاطمہ رضوی نے قبول کرلی ہے۔انھوں نے چند ماہ قبل ذاتی سانحے سے گزرنے کے باوجود معیاری تحقیقی مضامین کے حصول، ان کی صبر آزما اصلاح، اور شمارے کی بروقت اشاعت میں جس دلچسپی، جانفشانی اور تندہی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے لیے خاکسار ان کا شکر گزار رہے۔